ĪQĀN- Vol: 03, Issue: 01, Dec-2020
DOI: 10.36755/iqan.v3i01.236 PP: 41-58

OPEN ACCESS
ĪQĀN
pISSN: 2617-3336
eISSN: 2617-3700
www.iqan.com.pk

اجتہاد کی اصولی مباحث اور ابن حزم کا نقطۂ نظر: تجزیاتی مطالعہ

Discourses of Principles of Ijtihād and Ibn e Ḥazm's Approach: an Analytical Study

Tahir Islam
Ph. D Scholar, Department of Islamic Studies,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan. < *tahir.islam@aiou.edu.pk* >

****Dr. Hafiza Shahida Perveen***
Assistant Professor, Department of Islamic Studies,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan. < *shahada.is@pu.edu.pk* >

Version of Record
Received: 12-Jul-20
Accepted: 01-Nov-20
Online/Print: 30-Dec-20

ABSTRACT

Ibn e Ḥazm was a notable and leading scholar of al-Ẓāhirīyyah. He extended enormous research work in the multiple Islamic sciences such as principles of jurisprudence ('Uṣūl), fiqh, and comparative study of religions & Islamic philosophy. He presents novel idea regarding juristic effort or Islamic legal reasoning (Ijtihād). Ibn e Ḥazm negates the very concept of analogical reasoning (Qiyās) and calls for mandatory adoption of ijtihad on everyone. Moreover, he mandates few necessary requirements for an Islamic jurist (mujtahid). Further elaborating his notion on this point, he presents different rankings of a mujtahid regarding their right and wrong inferences while performing juristic work. This paper presents discourses of principles of Ijtihād by Imām Ibn e Ḥazm.

Keywords: *Ibn e Ḥazm; Ẓāhirīyyah; Ijtihād; Qiyās; Uṣūl al-fiqh; Taqlīd; Islamic Law; Islamic Jurisprudence.*

CC BY

تعارف:

ابو محمد علی بن احمد ابن حزم رحمہ اللہ (456ھ) ظاہری مکتب فکر کے جلیل القدر امام تھے۔ انھوں نے فقہ، اصول فقہ، ادایان و مذاہب اور ادب جیسے متنوع موضوعات پر ممتاز تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جو آج بھی اہل علم کے لیے بنیادی مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابن حزمؒ اجتہاد کے متعلق جمہور علماے اصول کے بالمقابل منفرد زاویہ نگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اجتہاد کے متعلق مختلف نکات پر بحث کی ہے جس سے ان کا تصورِ اجتہاد اجاگر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اجتہاد کی تعریف، اجتہاد کے درجات، مجتہدین کے اقسام اور عامی پر اجتہاد کی فرضیت بنیادی مباحث ہیں۔

ذیل میں اس حوالے سے ابن حزمؒ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جائے گی:

اجتہاد کی لغوی تعریف:

ابن حزمؒ نے اپنی کتاب 'الاِحکام فی اصول الأحکام' میں اجتہاد کے لغوی مفہوم، اطلاقات اور اصولی اعتبار سے اس کی اہمیت و افادیت کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **"إن حقيقة بناء لفظة الاجتهاد أنه افتعال من الجهد وحقيقة معناها أنه استنفاد الجهد في طلب الشيء المرغوب إدراكه حيث يرجى وجوده فيه أو حيث يوقن بوجوده فيه هذا مالا خلاف بين أهل اللغة فيه والجهد بضم الجيم الطاقة والقوة تقول هذا جهدي أي طاقتي وقوتي والجهد بفتح الجيم سوء الحال وضيقتها تقول القوم في جهد أي في سوء حال"**[1]
>
> "لفظ اجتہاد کی حقیقت یہ ہے کہ یہ جہد سے بابِ افتعال ہے۔ اس کے معنی کی حقیقت اس قدر ہے کہ کسی ایسی شے کے لیے پوری طاقت صرف کر دی جائے جس کا ادراک مطلوب ہو کہ اس کا وجود اسی چیز میں متوقع ہو یا اس میں اس کا وجود یقینی ہو۔ اس امر میں اربابِ لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جُہد (جیم کے پیش کے ساتھ) کا مطلب ہے: طاقت و قوت؛ چناں چہ آپ کہتے ہیں: ھَذا جُھدِی یعنی یہ میری طاقت و قوت کے مطابق ہے۔ لیکن جب یہ لفظ جیم کے زبر کے ساتھ آئے تو بری اور تنگ حالت کا معنی دیتا ہے؛ القَوم فی جَہد کے معنی ہیں: فلاں گروہ بری اور تنگ صورت حال میں ہے"

اجتہاد کی مندرجہ بالا لغوی توضیح سے مترشح ہوتا ہے کہ اس میں کسی شے کے حصول کے لیے تمام تر انسانی قوت کو صرف کر دینے کا مفہوم پنہاں ہے۔ ابن حزمؒ کی یہ وضاحت زبان و لغت کے ماہرین کی آرا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جن کے یہاں اجتہاد اپنے اصلی معنٰی و اطلاقات میں امورِ شریعت کی معنویت اور ان کے تطبیقی پہلو کو بقدرِ وسعت و علم اجاگر کرنا ہے۔ جیسا کہ اسماعیل الجوہری نے اجتہاد کے لغوی معنٰی کو "کسی کام کی انجام دہی میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا" سے تعبیر کیا ہے۔[2]

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام** (بیروت: منشورات دار الآفاق الجدیدۃ، س ن)، ۸: ۱۳۳.

[2] اسماعیل الجوھری، **الصحاح تاج اللغۃ و صحاح العربیۃ** (بیروت: دار العلم للملایین، ۱۹۹۰ء)، ۱: ۴۶۰.

اجتہاد کی اصطلاحی تعریف:

اجتہاد کے لغوی معانی بیان کرنے کے بعد ابن حزم نے اجتہاد کے اصطلاحی مفہوم پر بحث کی ہے اور ایک ایسی جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اہل ظاہر کا تصورِ اجتہاد نمایاں ہو سکے۔ انھوں نے اجتہاد کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"فالاجتهاد في الشريعة هو استنفاد الطاقة في طلب حكم النازلة حيث يوجد ذلك الحكم"[1]

"شریعت میں اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی پیش آمدہ مسئلے کا حکم معلوم کرنے کے لیے تمام تر طاقت وہاں لگا دی جائے، جہاں سے اس کا حکم معلوم ہو سکے"

یہ حکم کہاں سے معلوم ہو گا؟ دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ابن حزمؒ نے لکھا ہے:

"والاجتهاد ليس قياسا ولا رأيا وإنما الاجتهاد إجهاد النفس واستفراغ الوسع في طلب حكم النازلة في القرآن والسنة فمن طلب القرآن و قرأ آياته وطلب في السنن و قرأ الأحاديث في طلب ما نزل به فقد اجتهد فإن وجدها منصوصة فقد أصاب فله أجران أجر الطلب وأجر الإصابة وإن طلبها في القرآن والسنة فلم يفهم موضعا منهما ولا وقف عليه وفاتت إدراكه فقد اجتهد فأخطأ فله أجر"[2]

"اجتہاد قیاس ہے، نہ رائے؛ اجتہاد تو قرآن و سنت سے کسی نئے پیش آنے والے مسئلے کا حکم معلوم کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت اور کاوش کو صرف کر دینے کا نام ہے۔ جس نے پیش آمدہ مسئلے کے حل کی خاطر قرآن مجید کی آیات کے مطالعے سے اس کا حکم تلاش کرنے کی کوشش کی اور سنت سے حکم طلب کرنے کے لیے احادیث کا مطالعہ کیا تو اس نے اجتہاد کیا۔ اگر اس نے نصوص میں اس کا حل پا لیا تو وہ درست بات تک پہنچ گیا اور اس کے لیے دوہرا اجر ہے؛ ایک اجر طلب و جستجو کا اور دوسرا درستی کو پا لینے کا۔ لیکن اگر اس نے قرآن و سنت میں اس مسئلے کا حکم تلاش کیا اور اس مقام تک رسائی پا سکا، نہ اس سے باخبر ہی ہو سکا اور اس کے ادراک سے محروم رہ گیا تو اس نے بھی اجتہاد کیا تاہم اس میں خطا کا مرتکب ہوا، پس اس کے لیے ایک اجر ہے"

اجتہاد میں خطا اور صواب کی صورت میں اجر کے تفاوت کے حوالے سے ابن حزمؒ کا استدلال اس حدیث مبارکہ سے ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ"[3]

"جب حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے، اگر (اس کا اجتہاد) درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر درست نہ ہوا تو اس کے لیے ایک اجر ہے"

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۸: ۱۳۳.

[2] ایضاً، ۷: ۱۱۴.

[3] محمد بن اسماعیل البخاری، **الجامع الصحیح** (الریاض: دار السلام، ۱۹۹۹ء)، حدیث: ۷۳۵۲.

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک اجتہاد صرف کتاب وسنت ہی کی نصوص میں غور وفکر کا نام ہے اور رائے اور قیاس کے ذریعے اجتہاد نا قابل قبول ہے۔ اجتہاد کے متعلق اسی نکتے کو ایک اور مقام پر ابن حزمؒ نے یوں بیان کیا ہے:

"وقد بينا أن الاجتهاد هو افتعال من الجهد فهو في الدين إجهاد المرء نفسه في طلب ما تعبده الله تعالى به في القرآن وفيما صح عن النبي صلى الله عليه وسلم لأنه لا دين غيرهما"[1]

"ہم نے واضح کیا ہے کہ اجتہاد باب افتعال ہے جس کا مادہ جہد ہے؛ دین میں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جس چیز کا پابند کیا ہے، وہ اپنی پوری کوشش اس چیز کی تلاش میں صرف کر دے جو قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ سے صحیح طور پر ثابت شدہ احادیث میں ہے کہ دین ان دونوں امور کے علاوہ کسی شے کا نام نہیں ہے"

اس سے ابن حزمؒ کا مقصود یہ ہے کہ نصوصِ قرآن وحدیث کے علاوہ دیگر کوئی ماخذ نہیں ہے جس سے شرعی احکام کی تعیین وتوضیح کے لیے رجوع کیا جائے۔ اس طرح دراصل وہ قیاس، مصالح مرسلہ، استحسان اور استدلال کے دوسرے تمام طریقوں کو رد کرتے ہیں۔ اگرچہ قیاس واستصلاح اور دیگر اسالیب اجتہاد کی اپنی توجیہات موجود ہیں تاہم ابن حزم کی تعریف اجتہاد ایک پہلو سے بڑی عمدہ ہے کہ اس سے شریعت کے کمال وجامعیت کی شان اجاگر ہوتی ہے۔

اجتہاد کے لغوی اور شرعی مفہوم میں فرق:

ابن حزمؒ نے اجتہاد کی لغوی اور اصطلاحی تعریفوں کے بعد ان میں ایک بنیاد فرق کی نشان دہی کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"وإنما قلنا في تفسير الاجتهاد العام حيث يرجى وجوده فعلقنا الطلب بمواضع الرجاء وقلنا في تفسير الاجتهاد في الشريعة حيث يوجد ذلك الحكم فلم نعلقه بالرجاء لأن أحكام الشريعة كلها متيقن أن الله تعالىٰ قد بيَّنها بلا خلاف"[2]

"ہم نے اجتہاد کے عمومی ولغوی معنیٰ میں یہ بات کہی ہے کہ جہاں اس چیز کے ملنے کا گمان ہو اس جگہ اس کو تلاش کیا جائے پس ہم نے تلاش کو اُمید کی جگہوں سے بھی معلق کر دیا ہے لیکن اجتہاد کی شرعی تعریف میں ہم نے صرف اس جگہ کسی حکم کی تلاش کو اجتہاد کہا ہے جہاں وہ شرعی حکم پایا جاتا ہو اور اسے گمان کی جگہوں سے متعلق نہیں کیا ہے کیونکہ شریعت کے تمام احکامات یقینی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اِن کو خوب اچھی طرح واضح کر دیا ہے"

اس سے اُن کا مقصود یہ ہے کہ کتاب وسنت میں تمام مسائل کا حل یقینی طور پر موجود ہے، اس لیے اس کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اجتہاد، حکم شرعی کی متوقع جگہوں میں جہد وکاوش کا نام ہے بلکہ یہ یقینی مصدر سے تلاش حکم کی محنت سے عبارت ہے۔ اسی لیے انہوں نے اجتہاد کی شرعی تعریف میں کسی حکم کی تلاش کو اجتہاد کہا ہے نیز اسے گمان کی جگہوں سے متعلق نہیں کیا ہے۔

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۷: ۱۱۴.

[2] ایضاً، ۸: ۱۳۳.

احکام شریعت اور علماء:

ابن حزمؒ کی نظر میں احکام شریعت بالکل واضح ہیں اور عمومی طور سے علما کو معلوم ہیں، ابن حزم نے اس نکتے پر بھی بحث کی ہے کہ شرعی احکام میں کسی قسم کا خفا یا غموض اور پیچیدگی نہیں ہے بل کہ احکام شریعت بالکل واضح ہیں اور عمومی طور سے علما کو معلوم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فأحكام الشريعة كلها مضمونة الوجود لعامة العلماء وإن تعذّر وجود بعضها علىٰ بعض الناس فمحال ممتنع أن يتعذّر وجوده علىٰ كلهم لأن الله لا يكلفنا ما ليس في وسعنا وما تعذر وجوده علىٰ الكل فلم يكلّفنا الله إياه قط. قال الله تعالىٰ: 'لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَآ ' وقال تعالىٰ: 'وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ' وبالضرورة ندري أن تكليف إصابة مالا سبيل إلىٰ وجوده حرج''[1]
>
> ''شریعت کے تمام احکامات عام علما کے لیے موجود ہیں، اگرچہ شریعت کے بعض احکامات کے وجود کا علم بعض لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ بات محال اور ناممکن ہے کہ شرعی احکام کے وجود کا علم تمام لوگوں کے لیے مشکل اور ناممکن الحصول ہو کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صرف اسی چیز کا مکلّف بناتے ہیں کہ جس کی ہم طاقت رکھتے ہیں اور جس شرعی حکم کے وجود کا علم تمام لوگوں کے لیے ناممکن الحصول ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ہمیں کبھی بھی مکلّف نہیں بنایا۔ فرمان الٰہی ہے: اللہ تعالیٰ اسی چیز کا انسان کو مکلّف بناتے ہیں کہ جس کی وہ طاقت رکھتا ہے۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اس نے تمھارے لیے دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اور یہ بات ہم بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ جس حکم کو معلوم کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اس کا مکلّف بنانا تنگی ہے''

اس سے ابن حزم کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی وسعت اور ہمہ گیری کا پہلو ثابت کریں کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام مسائل سے متعلق رہ نمائی نہ صرف موجود ہے بل کہ اس تک رسائی بھی ممکن ہے۔ لیکن چوں کہ انسانی فہم و فکر کی سطح یک ساں نہیں ہے اور انسانی استعداد کے تفاوت کی بنا پر اس میں فرق پایا جاتا ہے، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ بعض افراد شرعی حکم کو نہ پا سکیں لیکن یہ شریعت کا عیب نہیں ہے بل کہ انسانی صلاحیت کا قصور ہے۔ اس میں مجتہدین کی اجتہادی خطا کے پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اہل علم کسی مسئلے میں منشاے شارع سمجھنے میں غلطی کا شکار ہو سکتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی بھی عالم شریعت کے مقصود تک نہ پہنچ سکے کیوں کہ اس صورت میں یہ شریعت کی خامی شمار ہوگی کہ اس میں انسانوں کو ناممکن شے کے حصول کا پابند بنایا گیا ہے۔

پیش آمدہ مسائل کے حل کے مقامات:

اجتہاد کی تعریف میں ابن حزمؒ نے نت نئے مسائل کے حل کے لیے حکم شرعی کو اس کے مقامات میں تلاش کرنے پر زور دیا ہے، یہ کون سے مقامات ہیں؟ اس کا جواب ابن حزمؒ نے یوں دیا ہے:

> ''اتفق العلماء على أن القرآن وما حكم به رسول الله ﷺ أو قاله أو فعلعه أو أقره وقد علمه مواضع

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۸: ۱۳۳.

لوجود أحكام النوازل"[1]

"علما اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ نے جو فیصلہ فرمایا، یا کوئی بات ارشاد فرمائی، یا کوئی فعل سرانجام دیا، یا کسی چیز کو جانتے بوجھتے برقرار رکھا تو یہی وہ مقامات ہیں جہاں پیش آمدہ مسائل کا حل موجود ہوتا ہے"

ابن حزم نے یہاں بھی اسی اصول کا اثبات کیا ہے کہ فکر و اجتہاد میں اخذِ احکام کا اصلی مصدر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی اور ان کے ماسوا کوئی چیز نہیں ہے جہاں سے مسائل کے حل و کشود کے لیے رجوع کیا جائے۔ یہاں انھوں نے سنت کے قولی، فعلی اور تقریری پہلوؤں کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے کہ یہ تمام اقسام شریعت ہیں اور اجتہاد میں ان سے رہ نمائی لی جائے گی۔

مجتہد کے اوصاف:

اجتہاد کے مباحث میں یہ بحث بھی اہمیت کی حامل ہے کہ مجتہد کو کن شرائط و اوصاف کا حامل ہونا چاہیے؟ ابن حزمؒ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بتلایا ہے کہ اسے کن علوم سے آراستہ ہونا چاہیے۔ ابن حزمؒ کے نزدیک فقیہ یا مجتہد میں بعض صفات کا ہونا لازم ہے اور کچھ امور ایسے ہیں جن سے واقفیت اگرچہ فرض نہیں ہے اور وہ اضافی حیثیت رکھتے ہیں تاہم افادیت سے خالی نہیں ہیں۔

قرآن اور حدیث و سنت کا علم:

ابن حزمؒ کا کہنا ہے کہ جو لوگ فقہ، افتاء اور لوگوں کے مابین فیصلوں کے لیے مختص ہوں ان پر فرض ہے کہ وہ حسب طاقت تمام دینی علوم حاصل کریں یعنی احکامِ قرآن اور حدیثِ رسول ﷺ کا علم، پھر حدیث کے نقل ہونے کے مختلف مدارج و مراتب سے واقفیت پیدا کریں۔ راویوں کے صفات پہچانیں اور مسند حدیث کو مرسل اور ضعیف روایات سے جدا کرنے کی معرفت حاصل کریں۔ ابن حزمؒ کے نزدیک یہ منصوص امر ہے کیوں کہ اللہ کا فرمان ہے: لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ[2] یعنی دین میں گہری سمجھ بوجھ پیدا کریں تو احکام قرآن اور احکامِ رسول ہی دین کی اصل ہیں۔ پھر قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد ہے: 'إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا[3] اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو'۔ اس سے ہم پر یہ واجب ٹھہرا کہ عادل اور فاسق اور فقیہ اور غیر فقیہ راویوں میں امتیاز کریں۔[4]

ناسخ و منسوخ کی معرفت:

قرآن مجید سے استدلال کرتے ہوئے ابن حزمؒ نے ناسخ و منسوخ کی معرفت کو بھی لازم قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحكام في اصول الأحكام**، ۸: ۱۳۳.

[2] التوبۃ: ۱۲۲.

[3] الحجرات: ٦.

[4] علی بن احمد ابن حزم، **الإحكام في اصول الأحكام**، ۵: ۱۲۴.

"ففرض علينا معرفة الناسخ من المنسوخ"[1]

"ہم پر لازم ہے کہ ہم ناسخ اور منسوخ میں فرق کی معرفت حاصل کریں"

عربی لغت اور نحو کا علم:

اجتہاد کی بنیاد کتاب و سنت کے نصوص ہیں جو عربی زبان میں ہیں۔ کارِ اجتہاد کے لیے زبان و بیان کی نزاکتوں سے باخبر ہونا از بس ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر تمام ہی علما مجتہد کے لیے عربی زبان و ادب اور اس کے اصول و قواعد سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ابن حزمؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، انھوں نے لکھا ہے:

"وفرض على من قصد التفقه في الدين كما ذكرنا أن يستعين على ذلك من سائر العلوم بما تقتضيه حاجته إليه في فهم كلام ربه تعالى وكلام نبيه صلى الله عليه وسلم قال تعالى: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (ابراهيم: 04) ففرض على الفقيه أن يكون عالما بلسان العرب ليفهم عن الله عز وجل وعن النبي صلى الله عليه وسلم ويكون عالما بالنحو الذي هو ترتيب العرب لكلامهم الذي به نزل القرآن وبه يفهم معاني الكلام التي يعبر عنها باختلاف الحركات وبناء الألفاظ فمن جهل اللغة وهي الألفاظ الواقعة على المسميات وجهل النحو الذي هو علم اختلاف الحركات الواقعة لاختلاف المعاني فلم يعرف اللسان الذي به خاطبنا الله تعالى ونبينا صلى الله عليه وسلم ومن لم يعرف ذلك اللسان لم يحل له الفتيا فيه لأنه يفتي بما لا يدري وقد نهاه الله تعالى عن ذلك"[2]

"جو دین میں تفقہ کا ارادہ رکھتا ہے، اس پر فرض ہے کہ وہ اس باب میں ان تمام علوم سے مدد لے جو پروردگار اور اس کے نبی ﷺ کے کلام کے فہم کے لیے ضروری ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔" پس فقیہ پر لازم ہے کہ وہ عربی زبان کا عالم ہو تاکہ وہ اللہ اور نبی ﷺ کا خطاب سمجھ سکے۔ اسے نحو سے بھی واقفیت بہم پہنچانا چاہیے جو کلام عرب کی ترتیب سے عبارت ہے جس میں کہ قرآن نازل ہوا ہے؛ کلام کے معانی کا فہم اسی سے ممکن ہے جو حرکات کی تبدیلی اور الفاظ کی بناوٹ سے وجود میں آتے ہیں۔ جو شخص لغت سے بے خبر ہے جو مسمیات پر وارد ہونے والے الفاظ کا نام ہے اور نحو سے ناواقف ہے جو کہ اختلاف معانی کے لیے واقع ہونے والی حرکات کے اختلاف سے تعبیر ہے تو ایسا شخص اس زبان کو نہیں جانتا جس میں اللہ تعالیٰ اور ہمارے نبی ﷺ نے خطاب فرمایا ہے اور جو شخص اس زبان ہی سے لاعلم ہے، اس کے لیے فتویٰ دینا روا نہیں ہے کیوں کہ وہ ایسی بنیاد پر فتویٰ دے گا جس کی اسے کچھ خبر

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵: ۱۲۴.

[2] ایضاً، ۵: ۱۲۶.

نہیں ہے اور اس روش سے اللہ عزوجل نے منع فرمایا ہے"

اس کے لیے ابن حزمؒ نے درج ذیل آیات کریمہ سے استشہاد کیا ہے:

"وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ"[1]

"کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو"

"وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ"[2]

"بعض لوگ ایسے ہیں کہ کسی علم کے بغیر، خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں"

"هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ"[3]

"تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملات میں کیوں بحث کرے چلے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں"

"وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللهِ عَظِيْمٌ"[4]

"اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کی متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی"

ان تمام آیات میں علم سے تہی ہوتے ہوئے بحث، مباحثے کی مذمت کی گئی ہے، پس جب ایک شخص کو شریعت کی زبان کا علم نہیں ہے تو وہ اس کے متعلق رہ نمائی کا مجاز کیوں کر ہو سکتا ہے؟

علم سیَر سے آگاہی:

رسول اللہ ﷺ کے سیر اور مغازی سے آگاہی کو بھی ابن حزمؒ نے ایک کامل فقیہ و مجتہد کے لیے لازمی گردانا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"وفرض على الفقيه أن يكون عالما بسير النبي صلى الله عليه وسلم ليعلم آخر أوامره وأولها وحربه صلى الله عليه وسلم لمن حارب وسلمه لمن سالم وليعرف على ماذا حارب ولماذا وضع الحرب وحرم الدم بعد تحليله وأحكامه صلى الله عليه وسلم التي حكم بها"[5]

"فقیہ پر فرض ہے کہ وہ نبی ﷺ کی سیرت سے باخبر ہو تاکہ اسے آں حضرت ﷺ کے اوامر کے ابتدائی اور آخری حالات کا علم ہو سکے اور محاربین سے آپ ﷺ کی جنگوں اور صلح کے خواہش مندوں سے مصالحت کا پتا چل سکے نیز یہ

---

[1] الاسراء:۳۶.

[2] الحج:۳.

[3] آل عمران:۶۶.

[4] النور:۱۵.

[5] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵:۱۲۶.

معلوم ہو سکے کہ جنگ کے اسباب اور جنگ بندی کے محرکات کیا تھے اور خون حلال ہونے کے بعد اسے حرام کیوں کیا گیا ؟اسی سے وہ یہ بھی جان سکے گا کہ آں حضور ﷺ کے احکامات کیا تھے جن پر آپ ﷺ نے فیصلے صادر فرمائے"

علم سیر اور مغازیِ رسولؐ سے واقفیت کو اجتہاد کے شرائط میں شمار کرنا ابن حزم کے تصور اجتہاد کا امتیازی پہلو ہے کیوں کہ دیگر اہل علم عموماً اسے بیان نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسے سنت ہی کے عموم میں شامل کرتے ہوں تاہم ابن حزم نے اسے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ موجودہ دور میں اس کی اہمیت دوچند ہو چکی ہے کہ مسلم ریاستیں کئی عالمی معاہدوں کا حصہ ہیں اور اس ضمن میں علم سیر سے استفادہ ناگزیر ہے کہ اسلام کا قانون بین الاقوام اسی اساس پر استوار ہے۔

اجماع واختلاف کا علم:

شرائط اجتہاد کے سلسلے میں فقہا اجماعی امور کے علم کو بھی بیان کرتے ہیں اور بعض نے تو اسے فرض تک کہہ دیا ہے لیکن ابن حزمؒ اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ علم اضافی حیثیت رکھتا ہے اور مفید ہے تاہم فرض ولازم نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"لكن معرفة الاختلاف علم زائد قال سعيد بن جبير أعلم الناس أعلمهم بالاختلاف وصدق سعيد لأنه علم زائد وكذلك معرفة من أين قال كل قائل"[1]

"اختلاف کی معرفت زائد علم ہے۔ سعید بن جبیر (م ھ) کا قول ہے کہ لوگوں میں سے زیادہ عالم وہ ہے جو اختلاف کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ سعید نے سچ فرمایا کیوں کہ یہ اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی درجہ اس امر کا ہے کہ ہر شخص کے قول کا ماخذ معلوم ہو"

اس کا سبب یہ ہے کہ ابن حزم اصل میں اجماع صحابہ کو اہمیت دیتے ہیں اور بعد کے زمانوں میں وقوعِ اجماع کے امکان کو بہت کم سمجھتے ہیں، اس لیے ان کی نگاہ میں مجتہد کے لیے اختلاف و اجماع کا علم شرطِ لازم کی حیثیت تو نہیں رکھتا ہے تاہم اس کی افادیت سے بھی انھوں نے انکار نہیں کیا اور ایک زائد فائدے کے طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کیا ہر مجتہد مصیب ہے؟:

مباحثِ اجتہاد کے ضمن میں علما کے یہاں یہ قضیہ بھی بحث و مناقشے کا موضوع بنا ہے کہ کیا اجتہاد کرنے والا ہر مجتہد مصیب یعنی درستی کا حامل ہوتا ہے یا ایک مصیب اور ایک مخطی یعنی خطاکار؟ اکثر علما جن میں امام مالک (م179ھ)[2]، امام شافعی (م204ھ)[3] اور امام احمد (م241ھ) رحمہم اللہ[4] کے نزدیک ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا بل کہ مختلف اجتہادات کی صورت میں ایک مجتہد کا اجتہاد درست ہوگا

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵:۱۲۸.

[2] احمد بن ادریس القرافی، **شرح تنقیح الفصول فی اختصار المحصول فی الاصول** (بیروت: دار الفکر، ۲۰۰۴ء)، ۴۳۹.

[3] ابراہیم بن علی ابو اسحاق الشیرازی، **اللمع فی اصول الفقہ** (بحرین: مکتبہ نظام یعقوبی الخاصۃ، ۲۰۱۲ء)، ۱۳۰.

[4] محمد بن احمد ابن النجار الحنبلی، **مختصر التحریر شرح الکوکب المنیر** (الریاض: مکتبۃ العبیکان، ۱۹۹۷ء)، ۴:۴۸۹.

اور وہی مصیب کہلائے گا جب کہ دوسرا غلطی پر ہو گا۔ بعض فقہا کی رائے میں ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے؛ یہ رائے امام ابو حنیفہؒ (م150ھ) کی طرف منسوب ہے[1] مگر احناف کا یہ مسلک نہیں ہے۔[2] معتزلہ[3]، امام الحرمین الجوینیؒ (م478ھ)[4] اور قاضی ابو بکر ابن العربیؒ (م546ھ)[5] نے بھی یہی دوسری رائے اختیار کی ہے۔

ابن حزمؒ نے اس موقف کو کلی طور پر رد کیا ہے کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے؛ ان کی نظر میں ایک ہی مجتہد درست ہوتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے پر ایک مستقل باب میں بحث کی ہے اور ہر مجتہد کو مصیب کہنے والوں کے جملہ دلائل پر نقد کیا ہے۔ طویل بحث کے بعد ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے، ان کے لیے لازم آتا ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں جنتی بھی ہو اور دوزخی بھی کیوں کہ ایک ہی شخص کے متعلق بعض اوقات اختلاف ہوتا ہے کہ وہ کافر ہے یا مسلمان جیسے تاویل کرنے والے لوگوں کا معاملہ ہے۔ اب اگر ہر مجتہد مصیب ہے تو اسے کافر کہنے والا بھی حق پر ہے اور مسلمان کہنے والا بھی تو گویا وہ شخص جنتی بھی ہوا اور دوزخی بھی۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو وسوسوں کا شکار ہو کیوں کہ اہل اہوا کی تکفیر اور عدم تکفیر کے متعلق صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اس مبحث کے اختتام پر ابن حزمؒ نے لکھا ہے:

> ''اس معاملے میں یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس کا ایک ہی راستا ہے اور دیگر راہیں، اس کی راہ سے جدا ہیں۔ اسی طرح نبی ﷺ نے بھی واضح طور پر مجتہد صحابہؓ کی ایک جماعت کے اجتہادات میں ان کی تغلیط فرمائی ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت ابو السنابل رضی اللہ عنہم کے متعلق ذکر ملتا ہے''[6]

اسی طرح ابنِ حزمؒ ''المحلیٰ'' میں لکھتے ہیں:

> ''وَمَنْ ادَّعَى أَنَّ الْأَقْوَالَ كُلَّهَا حَقٌّ وَأَنَّ كُلَّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ، فَقَدْ قَالَ قَوْلًا لَمْ يَأْتِ بِهِ قُرْآنٌ وَلَا سُنَّةٌ وَلَا إجْمَاعٌ وَلَا مَعْقُولٌ، وَمَا كَانَ هَكَذَا فَهُوَ بَاطِلٌ، وَيُبْطِلُهُ أَيْضًا قَوْلُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: إذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ، فَنَصَّ – عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ – أَنَّ الْمُجْتَهِدَ قَدْ يُخْطِئُ''[7]

---

[1] عبد العزیز احمد بن محمد البخاری، **کشف الاسرار عن الاصول**، (بیروت: دار الکتاب العربی، س ن)، ۴: ۱۸.

[2] احمد بن ابی سہل السرخسی، **اصول السرخسی** (حیدر آباد: لجنۃ احیاء المعارف العثمانیہ، ۱۹۹۳ء)، ۲: ۱۳۱.

[3] عبد العزیز احمد بن محمد البخاری، **کشف الاسرار عن الاصول**، ۴: ۱۶.

[4] ابو المعالی الجوینی، **التلخیص فی اصول الفقہ** (بیروت: دار البشائر الاسلامیہ، س ن)، ۳: ۴۴۴.

[5] ابو بکر ابن العربی، **المحصول فی اصول الفقہ** (عمان: دار البیارق، ۱۹۹۹ء)، ۱۵۲.

[6] علی بن احمد ابن حزم، **الاحکام فی اصول الأحکام**، ۵: ۷۰.

[7] علی بن احمد ابن حزم، **المحلیٰ بالآثار** (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، س ن)، ۱: ۸۹.

"جس کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام ہی اقوال حق ہیں اور ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے تو اس نے ایسی بات کہی ہے جو قرآن وسنت اور اجماع میں ملتی ہے نہ کسی عقلی دلیل سے ثابت ہوتی ہے؛ اور ایسا دعویٰ باطل ہوتا ہے۔ اس دعوے کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی باطل کرتا ہے: "جب حاکم اجتہاد کرے اور اس میں خطا کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔" آں حضرت ﷺ نے تصریح فرمادی کہ مجتہد غلطی بھی کر جاتا ہے"

اجتہاد کے اقسام بہ اعتبارِ صواب وخطا:

مجتہد کا اجتہاد درست ہے یا غلط، اس پہلو سے ابنِ حزمؒ نے اس کی چار صورتیں بیان کی ہیں:

اول: وہ اجتہاد جس پر دوہرا اجر ہے؛ یعنی انسان حق اور درست نتیجے پر پہنچے اور اس پر عمل پیرا ہو اور اسے معلوم بھی ہو کہ یہ حق ہے۔ اس کو ایک اجر نیت کا اور دوسرا عمل کا ملے گا۔

دوم: وہ اجتہاد جس پر عمل کرنے پر دوہرا گناہ ہو۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو غلط چیز کو اختیار کرتا ہے اور اسے پتا ہوتا ہے کہ یہ امر باطل ہے۔ اسے ایک گناہ غلط نیت اور ارادہ کا اور دوسرا گناہ اس پر عمل کا ہے۔

سوم: وہ اجتہاد ہے کہ انسان کا عمل تو حق ہو لیکن خود اسے باطل سمجھ رہا ہو یا کسی باطل کو ترک کر دے اور خود اسے حق سمجھتا ہو۔ اس پر درست عمل کرنے یا باطل کو ترک کرنے کا گناہ تو نہیں ہوگا تاہم اس کی نیت چونکہ درست نہیں، سو ایک گناہ کا مرتکب ضرور ہوگا۔

چہارم: وہ کسی باطل عمل کو حق سمجھ کر اختیار کرے یا کسی حق بات کو باطل گردانتے ہوئے ترک کر دے۔ یہ ایک اجر پائے گا کیوں کہ اس کی نیت درست ہے، تاہم عمل میں خطا ہے[1]۔

ابنِ حزم نے دوسرے مقام پر اسی مسئلہ کو ایک اور انداز میں بیان کیا ہے اور مجتہدین کی بنیادی طور پر دو قسمیں قرار دی ہیں:

- ایک وہ جو درست نتیجے تک پہنچ جائیں؛ یہ دوہرے اجر کے سزاوار ہیں۔
- دوسرا وہ مجتہد جو صحیح نتیجہ نہ پا سکیں؛ یہ مخطی ہیں۔ جو کہ دو قسموں میں منقسم ہیں:

اول: جو معذور اور ایک اجر کا مستحق ہے؛ اس کے اجتہاد نے اسے جس بات تک پہنچایا وہ اسے حق سمجھتا ہے لیکن در حقیقت وہ خطا ہے۔

دوم: وہ جو مخطی بھی ہے اور اثم وگناہ کا مستوجب بھی ہے۔ یہ وہ ہے جس نے جان بوجھ کر اس قول کو اختیار کر لیا جس کی غلطی اس پر واضح تھی یا کسی ایسی بات کا قائل ہوا جس کی صحت و درستی کی کوئی دلیل اس کے پاس موجود نہ تھی۔[2]

عامی پر اجتہاد کی فرضیت و کیفیت:

ابن حزمؒ کے تصورِ اجتہاد کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ علما کے لیے اجتہاد کو لازم قرار دیتے ہیں بل کہ عامی پر بھی اجتہاد واجب سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۶: ۱۵۹.

[2] ایضاً، ۸: ۱۳۸.

"ففرض على كل أحد طلب ما يلزمه على حسب ما يقدر عليه من الاجتهاد لنفسه في تعرف ما الزمه لله تعالى إياه"[1]

"ہر ایک پر فرض ہے کہ وہ جس قدر ممکن ہو اپنے اجتہاد کے لیے لازمی امور کی طلب و جستجو کرے تاکہ وہ پہچان سکے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس شے کا پابند کیا ہے؟"

گویا ابنِ حزمؒ کے نزدیک ہر مسلمان اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق اجتہاد کرے گا۔ عامی شخص کے اجتہاد کی کیفیت اور نوعیت کیا ہوگی؟ اس کے متعلق ابنِ حزمؒ کی آرا سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علما سے استصواب ہی کو عامی کا اجتہاد قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ کسی پیش آمدہ مسئلے کے متعلق عامی کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ لکھتے ہیں:

"ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ اللہ عزوجل نے تقلید کو حرام قرار دیا ہے اور عامی اور عالم میں کوئی فرق نہیں کیا بل کہ اس کا خطاب ہر شخص کے لیے ہے۔ پس تقلید جس طرح ایک متبحر عالم پر حرام ہے، اسی طرح عامی، گھر میں بیٹھنے والی دو شیزہ اور پہاڑوں میں موجود ایک چرواہے پر بھی حرام ہے"[2]

انسان پر جو دینی کام فرض ہیں، ان میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم تلاش کرنے کے لیے اجتہاد ہر عامی شخص پر لازم ہے جیسا کہ وہ عالم پر لازم ہے؛ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پس جو شخص دینی امور میں تقلید کرتا ہے، وہ اللہ عزوجل کی معصیت کا مرتکب اور گنہ گار ہے۔ لیکن اجتہاد کی کیفیت میں عامی اور عالم مختلف ہیں؛ ہر انسان پر اسی قدر اجتہاد لازم ہے، جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

" لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا"[3]

"اللہ تعالیٰ کسی متنفس پر اس کی قدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا"

نیز فرمایا:

"فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ"[4]

"تم اللہ سے ڈرو جتنی تم میں استطاعت ہے"

گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طاقت کے مطابق ہی ذمہ دار ٹھیرایا ہے اور جو ہماری استطاعت سے باہر ہو، وہ ہم سے ساقط ہے۔ یہ واضح نص ہے کہ ہر شخص پر دینی امور میں اسی قدر بحث و تحقیق لازم ہے، جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے؛ پس ہر شخص پر اجتہاد کا اتنا ہی حصہ ہے

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵: ۱۲۱.

[2] ایضاً، ۵: ۱۲۵.

[3] البقرۃ: ۲۸۶.

[4] التغابن: ۱۶.

جتنی اس میں طاقت ہے،[1] آگے لکھتے ہیں:

"عامی کا اجتہاد یہ ہے کہ وہ عالم سے دینی معاملات میں سوال کرے اور وہ اسے فتویٰ دے تو وہ اس سے دریافت کرے کہ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس طرح حکم دیا ہے؟ اگر عالم اِثبات میں جواب دے تو اس پر عمل کرے اور اُس پر اس سے زائد تحقیق ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ عالم کہے کہ نہیں؛ یا کہے کہ یہ میری رائے ہے؛ یا کہے کہ یہ مالک یا ابن قاسم یا ابو حنیفہ یا ابو یوسف یا شافعی یا احمد یا داؤد کا قول ہے؛ یا نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی صحابی یا تابعی کا نام لے؛ یا سائل کو ڈانٹ کر خاموش کرا دے تو سائل کے لیے اس فتویٰ کو قبول کرنا حرام ہے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ کسی دوسرے عالم سے مسئلہ دریافت کرے اور جہاں سے بھی ممکن ہو اس کا جواب تلاش کرے کیوں کہ ایک مسلمان جب کسی درپیش مسئلے کے متعلق علما سے سوال کرتا ہے تو اس کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ عالم اُسے اس مسئلے میں اللہ تعالیٰ اور جناب رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے باخبر کرے اور بتلائے کہ اس حوالے سے دین اسلام میں کیا چیز واجب ہے۔ اگر سائل کو معلوم ہو کہ وہ عالم اسے کوئی اور ہی بات بتلائے گا تو اس سے دور بھاگنا چاہیے"[2]

اس واضح ہوتا ہے کہ ایک عامی کے اجتہاد سے ابنِ حزمؒ کی کیا رائے مراد ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص کے لیے اجتہاد مطلق کے مرتبے پر فائز ہونا لازم ہو۔ شیخ زاہد الکوثریؒ (م 1952ء) کی رائے بھی محلِ نظر ٹھہرتی ہے کہ اہلِ ظاہر نے تقلید سے متعلق جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس سے دنیاوی مصالح معطل ہو کر رہ جاتے ہیں اور امت کو وہ مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے جو اس کے دائرۂ امکان سے باہر ہے؛ بل کہ امت میں متواتر اور متوارث یہ ہے کہ عالم اپنے علم پر عمل کرے اور عامی علما سے مسئلہ پوچھ لے[3]۔ ابنِ حزمؒ کا بھی یہی موقف ہے کہ ایک عامی کے لیے ہے کہ وہ عالم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم دریافت کرے لیکن اس کے علاوہ کسی انسان کی رائے کو تسلیم نہ کرے اور یہی اس کا اجتہاد ہے۔

عامی کے مختلف مدارج:

ابنِ حزمؒ نے عامۃ الناس کے مختلف مدارج و مراتب قرار دیے ہیں:

"پہلے درجے میں ہر وہ عاقل و بالغ مسلمان کو پابند بناتے ہیں کہ وہ دین کے بنیادی فرائض مثلاً طہارت، نماز اور کھانے پینے، لباس، ازدواجیات، حرمت جان و مال وغیرہ کے متعلق حلال و حرام کی تعلیم حاصل کرے کہ ان معاملات میں جہل روا نہیں ہے۔ مسلم حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے"

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۶: ۱۵۱.

[2] ایضاً، ۶: ۱۵۱.

[3] یہ اعتراض محمد ابو زہرہ نے ابن حزم کی کتاب **النبذ فی اصول الفقہ** پر شیخ محمد زاہد کوثری کے حاشیے سے نقل کیا ہے۔ دیکھیے: محمد ابو زہرہ، **ابن حزم حیاتہ وعصرہ آراؤہ وفقھہ** (القاہرہ: دار الفکر العربی، ۱۹۷۸ء)، ۲۷۲.

اس کے بعد جو مسلمان مال دار اور صاحب نصاب ہے، وہ زکات کے مسائل سیکھے۔ جس پر زکات نہیں، اس کے لیے مسائل زکات کا علم حاصل کرنا بھی فرض نہیں ہے۔ اسی طرح ہر شعبہ زندگی سے متعلق لوگ اس بارے میں شرعی تعلیمات سے واقفیت بہم پہنچائیں؛ مثلاً افواج اور عساکر میں ہیں تو جہاد، غنیمت اور فے کی تقسیم کے متعلقہ احکام شریعت سیکھیں؛ ججوں اور قاضیوں کو قضاءت اور حدود کے مسائل سیکھنے چاہییں؛ تاجروں کو خرید و فروخت کے احکام سے باخبر ہونا چاہیے۔ جو لوگ ان شعبوں سے براہِ راست منسلک نہیں ہیں، ان کے لیے یہ احکام سیکھنا ضروری نہیں ہے۔[1] آگے لکھتے ہیں:

"فالناس في ذلك على مراتب فمن ارتفع فهمه عن فهمهم أغتام المجلوبين من بلاد العجم منذ قريب وعن فهم أغتام العامة فإنه لا يجزيه في ذلك ما يجزي من ذكرنا لكن يجتهد هذا على حسب ما يطيق في البحث عما نابه من نص الكتاب والسنة ودلائلهما ومن الإجماع ودلائله ويلزم هذا إذا سأل الفقيه فأفتاه أن يقول له من أين قلت هذا فيتعلم من ذلك مقدار ما انتهت إليه طاقته وبلغه فهمه"[2]

"لوگ اس باب میں مختلف مراتب پر ہیں، جس کا فہم عجمی علاقوں سے آنے والے، اور صاف عربی بولنے سے قاصر لوگوں کے فہم سے زیادہ ہو، یا وہ عام لوگوں کی سمجھ بوجھ سے زیادہ فہم رکھتا ہو، اس کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ بنیادی علم حاصل کرے بل کہ یہ اپنی استطاعت کے مطابق اجتہاد کرے گا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ جب یہ فقیہ سے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں کتاب و سنت اور اجماع کے دلائل میں مسئلہ پوچھے اور وہ اسے فتویٰ دے دے تو یہ اس سے استفسار کرے کہ تم نے یہ بات کہاں سے اخذ کی ہے؟ گویا وہ اس کے متعلق اتنا علم حاصل کرے جہاں تک اس کی استطاعت ہو، اور اس کے فہم کی رسائی حاصل ہو سکے۔"

اگر عامی کے سامنے مختلف علما کے فتوے ہوں جو باہم متعارض ہوں تو ابنِ حزم کے مطابق اسے صحیح بات تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھنا چاہیے؛ اس صورت میں عامی ایک عالم کے مانند ہوگا جس کے لیے شرعی دلائل کے ظاہری تعارض کی وجہ سے کسی مسئلہ کا حل واضح نہ ہو رہا ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ وہ توقف کرے گا اور طلب و تحقیق جاری رکھے گا، یہاں تک کہ اس کے لیے حق ظاہر ہو جائے، یا پھر اسے اسی حالت میں موت آجائے تو یہ آخرت میں بلند مرتبہ پر فائز ہوگا اور اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔[3]

تقلید کی ممانعت:

عامی پر اجتہاد کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ساتھ ابن حزمؒ تقلید کی کلیتًا نفی کرتے ہیں؛ ان کے نزدیک تقلید کسی بھی انسان کے لیے جائز نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵: ۱۲۲.

[2] ایضاً، ۵: ۱۲۴.

[3] ایضاً، ۶: ۱۶۱.

''وَلَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يُقَلِّدَ أَحَدًا، لَا حَيًّا وَلَا مَيِّتًا، وَعَلَى كُلِّ أَحَدٍ مِنْ الِاجْتِهَادِ حَسَبَ طَاقَتِهِ''[1]

''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی تقلید کرے، خواہ وہ زندہ ہو یا فوت شدہ؛ ہر ایک پر اس کی استطاعت کے مطابق اجتہاد فرض ہے۔''

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''والتقليد حرَام وَلَا يحل لأحد ان يَأْخُذ بقول أحد بِلَا برهَان''[2]

''تقلید حرام ہے اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ دلیل کے بغیر دوسرے شخص کی بات قبول کرے''

حرمت تقلید کے لیے انھوں نے درج ذیل آیت سے استدلال کیا ہے:

''اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ''[3]

''لوگو، جو کچھ تمہارے ربّ کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو اور اپنے ربّ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔''

''وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا''[4]

''ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔''

تقلید نہ کرنے والوں کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَه اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ''[5]

''بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رُجوع کر لیا اُن کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے اُن بندوں کو جو بات کو غور سے سُنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں''

اللہ عزوجل نے اختلاف و تنازع کی صورت میں صرف قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] علی بن احمد ابن حزم، **المحلیٰ بالآثار**، ۱: ۸۵.

[2] علی بن احمد ابن حزم، **النبذۃ الکافیۃ فی أحکام اصول الدین** (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۸۵ء)، ۷۱.

[3] الاعراف: ۳.

[4] البقرۃ: ۱۷۰.

[5] الزمر: ۱۷.

"فإن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ"[1]

"پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو"

ابن حزمؒ کے بہ قول تقلید کی حرمت پر صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے؛ نیز ائمہ اربعہ نے بھی اپنی تقلید سے منع کیا ہے۔ اگر تقلید جائز ہوتی تو ائمہ کے بجائے صحابۂ کرامؓ کی تقلید کی جاتی جن میں عمر، علی، ابن عباس اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنھم ایسے عظیم لوگ تھے۔[2] وہ کہتے ہیں کہ تقلید کی ممانعت عالم اور عامی سب کے لیے ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے عامی یا عالم کی تفریق نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے اس لیے ہر ایک کو اپنی وسعت کے مطابق اجتہاد کرنا چاہیے۔[3] ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ اجتہاد میں غلطی کرنے والا مقلد سے زیادہ اجر کا مستحق اور افضل ہے خواہ مقلد درست موقف کا حامل ہی کیوں نہ ہو کہ مقلد خدا کا نافرمان ہے۔[4] تقلید کے وجوب یا جواز کے لیے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان سب پر مفصل نقد کیا ہے اور تقلید کی نفی میں سلف کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔[5]

مجتہدین کے اقسام:

فقہا کے یہاں مجتہدین کے مختلف اقسام ہیں؛ مثلاً مجتہد مطلق، مجتہد مذہب، مجتہد ترجیح، مجتہد تخریج، مجتہد فتاوی وغیرہ۔ اس ضمن میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کیا اجتہاد، قابل تقسیم شے ہے یا نہیں؟ یعنی کیا ایک شخص تمام مسائل کے بجائے بعض مسائل میں اجتہاد کا مجاز ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ابن حزمؒ کے نزدیک اگر کوئی شخص ایک بھی مسئلے کا علم رکھتا ہے تو وہ اس کے متعلق اجتہاد و فتویٰ کا حق رکھتا ہے:

"وكل من علم مسألة واحدة من دينه على الرتبة التي ذكرنا أجاز له أن يفتي بها وليس جهله بما جهل بمانع من أن يفتي بما علم ولا علمه بما علم بمبيح له أن يفتي فيما جهل وليس أحد بعد النبي ﷺ إلا وقد غاب عنه من العلم كثير هو موجود عند غيره فلو لم يفت إلا من أحاط بجميع العلم لما حل لأحد من الناس بعد رسول اللهﷺ أن يفتي أصلا وهذا لا يقوله مسلم وهو إبطال للدين وكفر من قائله"[6]

---

[1] النساء:۵۹.

[2] علی بن احمد ابن حزم، **النبذۃ الکافیۃ فی أحکام اصول الدین**، ۷۲.

[3] ایضاً، ۷۲.

[4] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۶:۱۶۵.

[5] دیکھیے: علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۶:۵۹۔ اس کے علاوہ ابن حزم کے رسالے **ملخص إبطال القیاس والرأی والاستحسان والتقلید و التعلیل** میں بھی تقلید کی حرمت پر بحث موجود ہے۔

[6] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵:۱۲۸.

''ہر وہ شخص جو ایک بھی دینی مسئلے کا اس درجہ علم رکھتا ہے جو ہم نے بیان کیا تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بارے میں فتویٰ دے۔ اس کا بعض مسائل سے لاعلم ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ ان مسائل میں فتویٰ دے جن کا اسے علم ہے اور اس علم کی بنا پر یہ بھی جائز نہیں کہ وہ ان مسائل میں بھی فتوے صادر کرے جن کا اسے علم نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے جس سے بہت سا علم مخفی نہ رہ گیا ہو جب کہ دوسرے کے پاس وہ موجود ہوتا ہے۔ اگر فتوے کے لیے تمام علم کا احاطہ ہونے کی شرط لگا دی جائے تو رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق ہی نہ ہوتا اور یہ بات کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا کہ یہ دین کو باطل کرنے کے مرادف اور قائل کے کفر کی دلیل ہے''

متعدد دیگر علما نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ ابو حامد محمد بن محمد غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) بھی اس کے قائل ہیں؛ انھوں نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک اجتہاد کوئی ایسا منصب نہیں ہے جو ناقابل تقسیم ہو کہ ممکن ہے کوئی شخص بعض مسائل میں منصب اجتہاد پر فائز ہو اور بعض دوسرے مسائل میں اسے یہ منصب حاصل نہ ہو[1]۔ ابن قدامہؒ (م ۶۲۰ھ) لکھتے ہیں:

''کسی خاص مسئلے میں اجتہاد کے لیے تمام مسائل میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہونا شرط نہیں ہے بل کہ جب ایک شخص زیر تحقیق مسئلے میں اس کے دلائل اور استدلال کے طریقے معلوم کر لے تو وہ اس خاص مسئلے میں مجتہد ہے، اگرچہ دیگر مسائل میں اجتہادی بصیرت سے بہرہ وَر نہ ہو۔ تم دیکھتے نہیں کہ صحابۂ کرامؓ اور بعد کے مجتہدین نے متعدد مسائل میں توقف اور سکوت اختیار کیا تھا: مثلاً امام مالک نے چالیس مسائل میں سے چھتیس کے متعلق فرمایا تھا کہ مجھے ان کا جواب معلوم نہیں ہے مگر لاعلمی کا یہ اعتراف ان کے مجتہد ہونے منافی نہیں سمجھا گیا''[2]

احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

''بعض اوقات ایک شخص کسی ایک مسئلے میں یا کسی ایک باب میں مجتہدانہ صلاحیت کا حامل ہوتا ہے لیکن دوسرے فن یا باب یا مسئلے میں اسے یہ بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ پس ہر عالم و فقیہ کا اجتہاد اس کے مبلغ علم کے مطابق ہوتا ہے''[3]

ابن ہمامؒ (م 861ھ) نے بھی مجتہد کی درج ذیل دو قسمیں بیان کی ہیں:

''ایک مجتہد مطلق جو تمام مسائل میں اجتہادی قابلیت رکھتا ہے؛ اور دوسرا مجتہد خاص جسے خاص خاص مسائل میں اجتہاد کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد خاص میں صرف انہی امور کے علم کی حاجت ہوتی ہے تو اس خاص مسئلے کی تحقیق کے لیے درگار ہوں، جس میں وہ اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے''[4]

بہر حال اجتہاد اور مجتہد کے مدارج کے متعلق ابن حزمؒ نے اگرچہ اس طرح تصریح نہیں کی جیسے دیگر فقہا نے باقاعدہ تقسیم کی ہے تاہم

---

[1] محمد بن محمد الغزالی، **المستصفیٰ من علم الاصول** (المدینۃ المنورۃ: شرکۃ المدینۃ المنورۃ للطباعۃ، س ن)، ۲: ۱۰۳.

[2] عبداللہ بن محمد ابن قدامہ، **روضۃ الناظر وجنۃ المناظر فی اصول الفقہ** (الریاض: مکتبۃ الرشد، ۱۹۹۳ء)، ۱۹۱.

[3] احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ، **مجموع الفتاوی** (السعودیۃ: وزارۃ الشؤون الاسلامیۃ والدعوۃ والارشاد، ۲۰۰۴ء)، ۳: ۳۸۴.

[4] محمد بن عبدالواحد ابن الھمام، **التحریر فی اصول الفقہ** (مصر: مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۵۱ھ)، ۵۲۴.

ان کی آرا کی روشنی میں مجتہد کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں:
ایک، وہ مجتہد جو پورے دین میں تفقہ حاصل کرتا ہے اور اس کے متعلق تمام علوم سے آراستہ ہے۔ اسے دیگر فقہا مجتہد مطلق کہتے ہیں۔
دوسرا، وہ جو بعض یا کسی ایک ہی مسئلے کا علم رکھتا ہے۔ اسے مجتہد مسئلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[1]

حاصل بحث:

اجتہاد کے بنیادی مباحث کے حوالے سے ابن حزم کی آرا کے مطالعے سے درج ذیل امور نظر و بصر کے سامنے آتے ہیں:

- اجتہاد، قیاس و رائے کا نام نہیں بل کہ کتاب و سنت سے کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیت کھپا دینے سے عبارت ہے۔
- حکم شرعی صرف اور صرف قرآن مجید اور حدیث نبوی ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔
- کامل مجتہد اور فقیہ کے لیے قرآن و سنت کا علم، ناسخ و منسوخ کی معرفت، عربی زبان و ادب کا علم اور علم سیر سے آگاہی فرض ہے۔ اجماع و اختلاف اور علما کے اقوال کا ماخذ معلوم ہو تو یہ بھی مفید ہے، تاہم ناگزیر نہیں ہے۔
- ہر مجتہد صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا بل کہ بعض مصیب ہوتے ہیں، اور بعض مخطی۔
- اجتہاد عالم پر ہی نہیں بل کہ عامی پر بھی فرض ہے۔
- کسی بھی مسلمان کے لیے تقلید کی کوئی گنجایش نہیں ہے؛ تقلید کی حرمت کتاب و سنت، اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔
- اجتہاد قابلِ تقسیم شے ہے اور ایک ہی مسئلے میں بھی اجتہاد روا ہے، بہ شرطے کہ اس کا علم ہو۔
- مجتہدین کے دو اقسام ہیں: ایک وہ جو تمام مسائل میں اجتہاد کے مجاز ہیں، اور دوسرے وہ حضرات جو بعض یا چند مسائل میں اس کی اہلیت سے رکھتے ہیں۔

@ 2020 by the author, this article is an open access article distributed Under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC-BY) (http://creativecommons.org/licenses/by/4.0/)

[1] علی بن احمد ابن حزم، **الإحکام فی اصول الأحکام**، ۵: ۱۲۱ تا ۱۲۷.